یتیم پوتے کی میراث

مولانا گوہر رحمٰن

وفاقی شرعی عدالت میں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ کی دفعہ ۴ کو، جس کی رو سے یتیم پوتے کو میراث میں حق دیا گیا ہے، اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا ہے کہ یہ شریعت سے متصادم ہے۔ مولانا گوہر رحمٰن نے اس موقف کے حق میں عدالت میں جو بیان دیا، اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ کی دفعہ ۴ میں کہا گیا ہے کہ:

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر ہوں) بہ حصہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

وراثت کا یہ وضعی قانون شرعی قانون سے یقیناً متصادم اور متناقض ہے اور یہ تصادم و تناقض روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مگر دور جدید کے متجددین کا طریقہ کار یہ ہے کہ غیر متعلقہ مباحث چھیڑ کر اور اسلام کے منصوص اور اجماعی احکام کو اجتہادی اور اختلافی مسائل کی شکل دے کر ان احکام کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا جائے۔ یہ طرز فکر اور طریقہ کار تحقیق نہیں بلکہ تلبیس ہے۔ آخر نصوص و اجماع سے متصادم اجتہاد بازی کو بحث و تحقیق اور استدلال کا نام کون دے سکتا ہے اور کیسے دے سکتا ہے؟ لیکن چونکہ ان متجددین اور مستشرقین کا وضع کردہ قانون ملک میں نافذ ہے جسے یہ عدالت ختم کر سکتی ہے، اس لیے میں اپنے دلائل عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، مگر اصل دلائل سے قبل چند مسلمہ اصول پیش کرتا ہوں۔

اصول ثلاثہ

۱۔ اسلام میں قرآن و سنت کو سپریم لا کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے قرآن و سنت کے متن اور نص کے خلاف قانون بنانے یا فیصلہ دینے کا حق کسی مسلمان کو حاصل نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا کفر و شرک اور ظلم و فسق ہے۔

۲۔ یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی بھی قانون کی وہ تعبیر و تشریح قابل اعتبار نہیں ہو سکتی جو اس قانون

کے ماہرین کی متفقہ تعبیر کے خلاف ہو۔ اس لیے قرآن و سنت کے متن اور نص کی وہ تعبیر و تشریح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جو قرآن و سنت کے ماہرین یعنی صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ و مجتہدینؒ کی متفقہ تعبیر کے خلاف ہو۔ ایسا کرنا تجدد ہے، اجتہاد نہیں۔

۳۔ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے اور جدید مسائل کے حل کے لیے علم و تحقیق کے اداروں میں آج بھی اجتہاد ہو رہا ہے، پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ لیکن قرآن و سنت کے متن اور اس کی متفقہ تعبیر کے خلاف اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کا اجتہاد کرنا اللہ و رسولؐ کے احکام کی تنسیخ یا ترمیم کے مترادف ہے جس کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

ان اصول ثلاثہ کی تذکیر کے بعد اب میں پوتے کی میراث کے بارے میں اپنے دلائل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو بنیادی طور پر تین قسم کے ہیں: قرآن کریم، سنت رسولؐ اور اجماع امت۔

قرآن کریم

۱۔ دور جاہلیت کے عربوں کا قانون وراثت یہ تھا کہ جو وارث قبیلے کے لیے لڑ سکتے تھے، میراث انھی کو دی جاتی تھی۔ عورتیں چونکہ لڑ نہیں سکتی تھیں اس لیے وہ میراث سے محروم ہوتی تھیں۔ اسی طرح کم سن بیٹے بھی میراث کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے اس لیے کہ وہ بھی لڑائی میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ قرآن کریم نے اس ظالمانہ قانون کو ختم کر کے یہ قانون نافذ کیا کہ جو وارث مورث کے قریب تر ہوں گے وہی میراث کے حق دار ہوں گے "الاقرب فالاقرب"۔ یہ قرآنی اصول درج ذیل آیت میں بیان ہوا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ○ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (سورۃ النساء ۴:۷-۸)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

اس آیت میں وضاحت و صراحت کے ساتھ یہ اصول بیان ہوا ہے کہ میراث کے استحقاق میں لڑنے کے قابل ہونے یا نہ ہونے کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جائے گا اور فقر و تنگ دستی یا کمزوری اور یتیمی کو بھی معیار نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ مورث کا قریب ترین رشتے دار کون ہے۔ یتیموں اور مسکینوں کی

کفالت اور خبر گیری کے لیے اسلام میں دوسرے احکام موجود ہیں جو ہر لحاظ سے کافی اور مکمل ہیں۔ اگر یتیمی کو بنیاد بنایا جائے تو پھر جو بھی یتیم ہو، اسے میراث ملنی چاہیے خواہ پوتا ہو، بھتیجا ہو یا بھانجا۔ اگر فقر و احتیاج کو معیار بنایا جائے، تو پھر مال دار بیٹوں کی جگہ فقیر و نادار بھائیوں یا بھتیجوں کو میراث دینی چاہیے۔ اور اگر نفس قرابت کو معیار قرار دیا جائے تو پھر ہر انسان دوسرے کا وارث بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اسلام نے یتیمی، ناداری اور نفس رشتہ داری کی جگہ "الاقرب فالاقرب" کو بنیاد بنایا ہے کہ ذوی الفروض کو مقررہ حصے دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے وہ قریب ترین عصبات کا حق ہے۔ اس لیے کہ تقسیم میراث کی علت یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کی مالی امداد اور معاشی کفالت نہیں ہے بلکہ انتقال ملکیت اس کی اصل علت ہے کہ جب کوئی شخص مر جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی املاک کس کی ملکیت میں دی جائیں؟ کیونکہ جایداد و املاک کو بغیر مالک کے آزاد چھوڑ دینے سے بد نظمی اور بدامنی پیدا ہو سکتی ہے اور ان سے پوری طرح فائدہ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسلام نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ مرنے والے کی املاک اس کے قریب ترین رشتے داروں کی ملکیت میں دے دی جائے۔ یہ قرآنی اصول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں بن سکتے۔

دوسرا اصول اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میراث ترکے میں جاری ہوتی ہے اور ترکہ وہ اموال و املاک ہوتی ہیں جن کو چھوڑ کر ان کا مالک دنیا سے انتقال کر چکا ہو۔ یہ اصول مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ میں لفظ "ترک" سے ثابت ہوتا ہے۔ مورث کی زندگی میں اس کے اموال و املاک نہ بیٹوں کے ہوتے ہیں اور نہ پوتوں کے بلکہ ان کا وہ خود مالک ہوتا ہے۔ لیکن عائلی قوانین کی دفعہ ۴ میں اس قرآنی اصول کو نظرانداز کر کے باپ کو اس کی زندگی ہی میں مورث قرار دے کر اس کے بیٹے اور بیٹی کا حصہ محفوظ کر لیا گیا ہے جو اس کے انتقال پر پوتے یا نواسے کو ملے گا۔ اسی طرح میراث کا بدیہی اور مسلمہ اصول ہے کہ وارث وہی شخص ہو سکتا ہے جو مورث کی موت کے وقت زندہ ہو۔ اس لیے کہ میراث انتقال ملکیت کے لیے تقسیم ہوتی ہے اور مردہ شخص کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ لیکن زیر غور قانون میں مردہ بیٹے اور بیٹی کو زندہ فرض کر کے اپنے باپ کا وارث بنایا گیا ہے اور پھر ان کا حصہ ان کے بیٹوں بیٹیوں کو یعنی مورث کے پوتوں پوتیوں کو دیا گیا ہے۔

سورۃ النساء کی مذکورہ آٹھویں آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے رشتے دار وراثت کے حق دار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ جب تقسیم میراث کے وقت ایسے قرابت دار اور یتامیٰ و مساکین حاضر ہو جائیں تو مشترک ترکے میں سے ان کو جتنا دے سکتے ہو، دے دو۔ اگر ان سے وارث مراد ہوتے تو وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ کی شرط نہ لگائی جاتی۔ اس لیے کہ وارث کا تقسیم میراث کے وقت

حاضر ہونا شرط نہیں ہے بلکہ صرف زندہ ہونا شرط ہے۔ اسی طرح اگر اس آیت میں فَارْزُقُوهُمْ سے وراثت میں ان کا حصہ دینا مقصد ہوتا تو اس میں یتامیٰ اور مساکین کا ذکر نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ ہر یتیم اور ہر مسکین کو تو متجددین بھی وراثت میں حصہ دار بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دراصل اس آیت کا تعلق میراث کے استحقاق سے نہیں ہے بلکہ اس میں ایک نفلی صدقے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ غیروارث قرابت داروں اور عام یتیموں اور مسکینوں کو تقسیم میراث کے وقت کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔ غیروارثوں کو ترکے میں سے کچھ دینا اگرچہ بعض کے نزدیک واجب ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک یہ حکم استحبابی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ وجوبی حکم ہوتا تو پھر ہر قسم کے ذوی القربیٰ اور یتامیٰ و مساکین، ذوی الفروض اور عصبات کے ساتھ وراثت میں حصہ دار بن جاتے اور اگر یہ سب حصہ دار ہیں تو پھر ذوی الفروض کے حصے متعین کرنے اور الاقربین کی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی (احکام القرآن لابن العربی اور تفسیر قرطبی، النساء، آیت ۸)۔

بڑے دکھ اور حیرت و تعجب کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عائلی قوانین کے ایک وکیل کمال فاروقی نے اس آیت کو یتیم پوتے کی وراثت کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کیا تھا اور فَارْزُقُوهُمْ کا ترجمہ کیا تھا: "اس میں سے ان کو ان کا حصہ دے دو" (ماہنامہ فکر و نظر، اسلام آباد، مارچ-اپریل ۱۹۶۵)۔

حالانکہ اس آیت میں پوتے کا ذکر نہیں ہوا بلکہ مطلق یتامیٰ و مساکین کا ذکر ہوا ہے۔ اگر یتامیٰ کے لفظ سے یتیم پوتے کا حق وراثت ثابت ہوتا ہے تو پھر مساکین کے لفظ سے ہر غریب و مسکین کا حق وراثت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ طفلانہ اجتہاد جس کی بنیاد پر یہ لوگ مذکورہ آیتوں سے ثابت شدہ اصولوں کی مخالفت کر رہے ہیں۔

۲- مذکورہ آیت میں حصص کے تعین کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا تھا (نَصِيبًا مَّفْرُوضًا) مگر ان حصص کی تفصیلات بیان نہیں ہوئی تھیں۔ یہ تفصیل سورۃ النساء کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں بیان ہوئی ہے جن کا ہمارے زیر بحث مسئلے سے متعلق حصہ یہ ہے:

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِىٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (سورۃ النساء ۴:۱۱)

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

اولاد کے مفہوم میں بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں اور پڑپوتے پڑپوتیاں سب شامل ہیں اس لیے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں "یابنی آدم" اور "یابنی اسرائیل" کا لفظ ذکر ہوا ہے جس سے پوری نسل انسانی اور نسل اسرائیلی مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انا سید ولد آدم "میں اولاد آدم کا سردار ہوں" یعنی پوری نسل انسانی کا سردار ہوں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اطلاق تو سب پر ہوتا ہے مگر

اس لفظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس کا جواب ابن عربیؒ اور جصاصؒ نے یہ دیا ہے کہ صلبی اولاد پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہوتا ہے اور بیٹے کی اولاد پر مجازاً ہوتا ہے۔

میرے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ لفظ اولاد کا استعمال دور کی اولاد (پوتوں، پڑپوتوں) کے لیے مجاز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پوتے سے ولد ہونے کی نفی کی جاسکتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ اگر یہ اس کے حقیقی معنی ہوتے تو اس کی نفی کی گنجایش نہ ہوتی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں ہے کہ پوتے کو تو (مجازاً) بیٹا کہا جاتا ہے مگر صلبی بیٹے کو پوتا کوئی بھی نہیں کہتا۔ بہرحال حقیقت ہو یا مجاز اس بات پر امت متفق ہے کہ اس جگہ پر اولاد کا انطباق سب پر ہوتا ہے (**احکام القرآن لابن العربی**، ج ۱، ص ۳۳۴، طبع بیروت، ۱۹۸۸)۔

لفظ اولاد کا اطلاق بیٹے کی اولاد (پوتوں) اور صلبی اولاد سب پر ہوتا ہے لیکن صلبی اولاد پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہوتا ہے اور بیٹے کی اولاد پر مجازاً ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صلبی اولاد کی موجودگی میں اس سے پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے اور نہ پوتے بیٹوں کے ساتھ ان کے حصوں میں شریک ہو سکتے ہیں (**احکام القرآن للجصاص**، ج ۳، ص ۱۴)۔

حقیقی اور مجازی معنوں کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ "معنی حقیقی" کی نفی نہیں کی جاسکتی اور "معنی مجازی" کی نفی کی جاسکتی ہے۔ ابن عربیؒ نے اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ پوتوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ میرے بیٹے نہیں ہیں لیکن بیٹوں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ میرے بیٹے نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹوں پر لفظ اولاد کا اطلاق حقیقی معنوں میں ہوتا ہے اور پوتوں پر اس کا اطلاق مجازی معنوں میں ہوتا ہے۔ امام جصاصؒ نے جو یہ کہا ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے اور نہ پوتے بیٹوں کے ساتھ میراث میں شریک ہوسکتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عربیت کا قاعدہ ہے کہ ایک ہی لفظ سے بیک وقت اور بیک نسبت حقیقی اور مجازی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے اور جب تک "حقیقی معنی" مراد لینا ناممکن نہ ہو، اس وقت تک "مجازی معنی" مراد لینا جائز ہی نہیں ہے۔ عربیت کے اس قاعدے سے مبتدی طالب علم بھی واقف ہیں۔ لہٰذا جب کسی مورث کا بیٹا موجود ہو، جو حقیقی اولاد ہے تو اس وقت اولادکم سے پوتا مراد لینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ حقیقت کی موجودگی میں مجاز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر بیٹے کے ساتھ پوتے کو وراثت میں حصہ دار بنا کر دونوں مراد لے لیے جائیں تو بیک وقت اور بیک نسبت حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع لازم آتا ہے جو عربی قواعد کے اعتبار سے منع ہے۔ البتہ اگر کسی مورث کے صلبی بیٹے موجود نہ ہوں تو اس صورت میں چونکہ حقیقی معنی مراد لینا ممکن نہیں ہیں کیونکہ حقیقت موجود ہی نہیں ہے، اس لیے لازماً مجازی اولاد کو یعنی پوتے پوتیوں کو میراث منتقل ہوگی۔ امام فخر

الدین رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ نے امام جصاصؒ ہی کی بات بڑے اچھے انداز میں تفسیر کبیر میں لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث بنانا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایک لفظ سے بیک وقت حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔ لہٰذا صلبی اولاد کی موجودگی کے وقت اولاد سے پوتے مراد نہیں لیے جاسکتے البتہ ان کی غیر موجودگی کے وقت پوتے ہی مراد لیے جائیں گے اور پوتوں کی غیر موجودگی کے وقت پڑپوتے مراد ہوں گے (تفسیر کبیر، ج ۹، ص ۲۰۸)۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لفظ "اولاد" کا استعمال بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں سب کے لیے حقیقی معنوں میں ہوتا ہے یعنی لفظ "اولاد" سے عام مفہوم مراد لے لیا جائے خواہ بلاواسطہ اولاد ہو یا ایک واسطے سے ہو یا دو واسطوں سے ہو یا تین واسطوں سے ہو اور ان سب کو حقیقی اولاد قرار دیا جائے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مورث کی میراث اس کے بیٹوں، پوتوں اور پڑپوتوں سب کو دی جائے گی (اگر سب موجود ہیں) یا اس کے لیے کوئی ترجیحی قاعدہ موجود ہے جس کی روشنی میں ترجیحات قائم کی جائیں گی؟ اس سوال کا جواب لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ میں موجود ہے کہ یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم سے اولادکم الاقربین مراد ہے۔ یعنی جو قریب تر ہوں، ان کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر بیٹے موجود ہوں تو پوتے حقیقی اولاد کہلانے کے باوجود محروم ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ بالواسطہ اولاد ہیں اور بیٹے بلاواسطہ اولاد ہیں۔

اسی طرح اگر بیٹے تو موجود نہ ہوں مگر پوتے موجود ہوں تو پڑپوتے محروم ہوں گے اس لیے کہ یہ دو واسطوں سے مورث کی اولاد ہیں اور پوتے ایک واسطے سے اس کی اولاد ہیں۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنا بہترین اور اولین طریقہ تفسیر ہے۔ اس قاعدے کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم آیت ۶ میں لفظ الاقربون کو آیت ۱۱ میں لفظ اولادکم کی تفسیر قرار دے دیں تو اس بحث کی ضرورت نہیں پڑتی کہ اولاد کے حقیقی معنی کیا ہیں اور مجازی معنی کیا ہیں؟ اس لیے کہ اولادکم کے ساتھ الاقربین کی صفت لگانے سے بیٹوں کی موجودگی میں پوتے اور پوتوں کی موجودگی میں پڑپوتے خود بخود خارج ہو جائیں گے۔

بعض متجددین نے کہا ہے کہ آیت ۶ میں الاقربون مورث کی صفت واقع ہوئی ہے تو اس کو آیت ۱۱ میں اولادکم کی تفسیر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ بات اتنی زیادہ کچی، سطحی اور طفلانہ ہے کہ اس کا جواب دینا بھی تحصیل حاصل نظر آتا ہے۔ آخر ان لوگوں کو یہ بدیہی حقیقت بھی معلوم نہیں ہے کہ قریب تر ہونا مورث اور وارث کے درمیان ایک نسبت ہے۔ جب مورث وارث کے قریب تر ہو گا تو لازماً وارث بھی اس کے قریب تر ہو گا۔ صلبی اولاد کی موجودگی میں جب دادا اپنے پوتے کے لیے اقرب نہیں ہے تو پوتا بھی

دادا کے لیے اقرب نہیں ہے۔ البتہ پڑپوتے کے مقابلے میں پوتا اور دادا دونوں ایک دوسرے کے اقرب ہیں۔ الاقرب فالاقرب کے اسی قرآنی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عربیؒ لکھتے ہیں:

اولاد کا لفظ اوپر نیچے سب کو شامل ہے۔ پس اگر وہ درجے میں برابر ہوں تو قرآن کی تقسیم کے مطابق اپنا اپنا حصہ لیں گے اور اگر درجے میں تفاوت ہو کہ بعض اوپر ہوں اور بعض نیچے ہوں تو اوپر والے نیچے والوں کو میراث سے محروم کر دیں گے۔ اس لیے کہ اوپر والا کہے گا کہ میں میت کا بیٹا ہوں اور نیچے والا کہے گا کہ میں میت کے بیٹے کا بیٹا ہوں تو جب اس کا درجہ نیچے آگیا تو اس کی دلیل بھی کٹ گئی۔

تمام مفسرین نے اسی طرح لکھا ہے کہ اگرچہ اولادکم کے مفہوم میں اولاد اور اولاد الاولاد سب شامل ہیں لیکن بیٹوں کی موجودگی میں پوتے وارث نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ اولادکم سے قریب ترین اولاد مراد ہے اور پوتے بیٹوں کے مقابلے میں بعید ہیں۔ مفسرین کی یہ تفسیر قرآن کے لفظ الاقربین پر مبنی ہے۔

سنت رسولؐ

تفسیر القرآن بالقرآن کے بعد تفسیر کا مستند ذریعہ سنت رسولؐ ہے۔ اللہ نے اپنا رسولؐ بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور احکام کی وضاحت کرے، یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (البقرہ ۲:۱۲۹)، "ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے"۔ اور لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل ۱۶:۴۴)، "تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے"۔ سنت رسولؐ کو نظرانداز کر کے قرآن کو سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً اسی زیربحث آیت یُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ کو لیجیے، اس میں لفظ "اولاد" کا ذکر بغیر کسی قید و شرط کے ہوا ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر، لیکن اللہ کے مقرر کردہ معلم قرآن نے وضاحت فرمائی ہے کہ:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (بخاری و مسلم، کتاب الفرائض، عن اسامہ بن زیدؓ)۔

مسلمان کافر سے میراث نہیں لے سکتا اور کافر مسلمان سے میراث نہیں لے سکتا۔

اسی طرح لفظ اولاد کے عموم و اطلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹے نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہو تو پھر بھی وہ اس کی وراثت لے سکتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ: اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ "قاتل اپنے مقتول کی میراث نہیں لے سکتا" (ترمذی، ابن ماجہ، کتاب الفرائض)۔

اسی طرح اس آیت میں لفظ "اولاد" کے ساتھ قریب یا بعید کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ اگر حدیث کو مدنظر نہ رکھا جائے اور سورۃ النساء کی چھٹی آیت میں لفظ الاَقْرَبُوْنَ سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں تو

پوتا اور پڑپوتا دادا کی میراث میں اپنے باپ کی زندگی میں بھی حصہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اولاد کے مفہوم میں پوتے اور پڑپوتے بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱ اور ۱۲ میں ذوی الفروض کے حصے تو متعین کر دیے گئے ہیں مگر یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ ان کے حصوں سے جو مال بچ جائے وہ کون لے گا؟ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات میراث کی تشریح کرتے ہوئے جو ضابطہ بیان فرمایا ہے وہ بڑا جامع و مانع ہے:

اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَھْلِھَا فَمَا بَقِیَ فَھُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ

مقررہ حصے ان کے مستحقین تک پہنچا دو اور جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب الفرائض کے چار ابواب میں چار اسانید کے ساتھ نقل کی ہے۔ باب میراث الولد من ابیہ وامہ، باب میراث ابن الابن اذ الم یکن ابن، باب میراث الجد مع الاب والاخوۃ اور باب ابنی عم احدھما اخ لام والآخر زوج اور مسلم شریف نے کتاب الفرائض کے اوائل میں یہ حدیث تین سندوں کے ساتھ نقل کی ہے۔ بخاری و مسلم دونوں نے جس حدیث کو نقل کیا ہو، اس کو اصطلاحاً "متفق علیہ" حدیث کہا جاتا ہے جو صحیح احادیث میں سنداً سب سے اقویٰ اور اصح حدیث سمجھی جاتی ہے۔

صحیحین کے علاوہ یہ حدیث سنن ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوحنیفہ اور مسند احمد میں بھی نقل ہوئی ہے۔ اس حدیث سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ ذوی الفروض کو ان کے حصے دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے وہ عصبات میں الاقرب فالاقرب کے اصول پر تقسیم ہو گا یعنی بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو حصہ نہیں ملے گا اور صلبی بیٹوں کی غیر موجودگی میں پوتے وارث ہوں گے۔ مگر حدیث کے الفاظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضابطہ ذوی الفروض کے لیے نہیں ہے بلکہ ان سے بچے ہوئے مال میں عصبات کے لیے ہے۔

اسی حدیث کی بنیاد پر زید بن ثابتؓ نے فرمایا ہے کہ:

جب صلبی اولاد نہ ہو تو بیٹوں کی اولاد ان کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ لڑکے لڑکوں کی طرح ہوں گے اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح ہوں گی۔ وہ اسی طرح میراث لیں گے جس طرح کہ بیٹے لیتے ہیں اور اسی طرح نچلے طبقے کو محروم کریں گے جس طرح کہ بیٹے نچلے طبقے کو محروم کرتے ہیں اور پوتا بیٹے کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتا (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابن الابن)۔

صحابہؓ میں سے زید بن ثابتؓ میراث کے احکام کو سب سے زیادہ جانتے تھے جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وَاَفْرَضُھُمْ زَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ (سنن ترمذی، کتاب المناقب)۔ صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ کے اس فتوے کی مخالفت کسی سے منقول نہیں ہے۔

علامہ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ:

وهذا الذی قاله اجماع (عمدة القاری، شرح بخاری، ج ۲۳، ص ۲۳۸)

زید بن ثابتؓ نے جو کچھ کہا ہے اس پر اجماع ہے۔

امام جصاصؒ فرماتے ہیں:

وهذا قول اهل العلم جمیعاً من الصحابة والتابعین (احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص ۱۵)۔

یہ تمام اہل علم صحابہ و تابعین کا قول ہے۔

اجماع امت

قرآن و سنت کے مذکورہ دلائل کی بنا پر امت مسلمہ کے تمام فقہا کا اجماع ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو میراث نہیں دی جا سکتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ آپؐ کی پوری امت باطل اور ضلالت پر متفق نہیں ہو سکتی۔ قرون ثلاثہ یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یہ مسئلہ اتفاقی رہا ہے اور یہ اتفاق آج تک تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ دور جدید میں بھی چند متجددین کے علاوہ اہل سنت اور اہل تشیع سب کے سب اس مسئلے پر متفق ہیں۔

امام مالکؒ متوفی ۱۷۹ھ لکھتے ہیں:

یہ متفق علیہ حکم ہے جس پر ہم نے اپنے شہر کے اہل علم کو مجتمع پایا ہے کہ بیٹوں کی اولاد کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اولاد کو حاصل ہے جبکہ صلبی اولاد موجود نہ ہو۔ لڑکے لڑکوں کی طرح ہوں گے اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح ہوں گی۔ پوتے اسی طرح میراث لیں گے جس طرح کہ بیٹے لیتے ہیں اور نچلے طبقے کو اسی طرح محروم کریں گے جس طرح کہ بیٹے محروم کرتے ہیں۔ پس اگر صلبی اولاد اور بیٹے کی اولاد جمع ہو جائے اور صلبی اولاد میں بیٹا موجود ہو تو اس کے ساتھ بیٹے کی اولاد میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا (الموطا امام مالک، کتاب الفرائض، باب میراث الصلب)۔

علامہ ابو الولید باجیؒ متوفی ۴۹۴ھ موطا کی شرح میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح امام مالکؒ نے کہا ہے کہ پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں میراث نہیں مل سکتی اس لیے کہ بیٹا پوتے کے مقابلے میں میت کے زیادہ قریب ہے (المنتقیٰ، ج ۶، ص ۲۲۶)۔

فقہ ظاہریہ کے امام ابن حزمؒ ظاہری متوفی ۴۵۶ھ نے بھی اس کو اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے:

پوتے بیٹے کی موجودگی میں کچھ بھی نہیں لے سکتے خواہ بیٹا ان کا "باپ" ہو یا چچا ہو۔ اور بھتیجے بھائی کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتے خواہ سگا بھائی ہو یا صرف باپ کی طرف سے ہو۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ذوی الفروض سے جو بچ جائے وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے

اور یہ یقینی اجماع ہے (المحلی لابن حزم، ج ۹، ص ۲۷۱)۔

ابن رشد قرطبیؒ متوفی ۵۹۵ھ نے بھی اس بارے میں اجماع نقل کیا ہے:

اہل علم نے اس بارے میں اجماع کر لیا ہے کہ پوتے بیٹوں کے قائم مقام اسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ بیٹے موجود نہ ہوں (بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ج ۲، ص ۳۴۰، طبع مصر، ۱۹۶۰)۔

امام قرطبیؒ متوفی ۶۷۱ھ نے بھی اس کو اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے:

اگر صلبی اولاد میں بیٹا موجود ہو تو پوتے کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے (تفسیر قرطبی، ج ۵، ص ۴۲)۔

امام نوویؒ متوفی ۶۷۶ھ، مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے اس پر اجماع کر لیا ہے کہ مقررہ حصوں سے جو بچ جائے وہ عصبات کے لیے ہے۔ اس طرح کہ اقرب فالاقرب کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لیے دور کا عصبہ (مثلاً پوتا) قریب کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتا (شرح مسلم، کتاب الفرائض، ج ۱۱، ص ۵۳، طبع قاہرہ، ۱۹۸۷)۔

شیعہ حضرات کے بہت بڑے فقیہ ابن بابویہ قمیؒ متوفی ۳۸۱ھ لکھتے ہیں:

پوتا اور نواسی "صلبی اولاد" کی موجودگی میں میراث نہیں لے سکتے اور نہ پوتے کا بیٹا پوتے کی موجودگی میں میراث لے سکتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس کا نسب قریب ہو وہ دور کے رشتے دار سے میراث کا زیادہ مستحق ہے (من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۱۹۶، طبع تہران)۔

ابو جعفر کلینیؒ متوفی ۳۲۸ھ نے "فروع کافی" میں اور ابو جعفر طوسیؒ متوفی ۴۶۰ھ نے "الاستبصار" میں بھی لکھا ہے کہ اولاد اسی وقت میراث لے سکتی ہے جبکہ صلبی اولاد موجود نہ ہو (فروع کافی، ج ۷، ص ۸۸، طبع تہران، الاستبصار، ج ۴، ص ۱۶۷)۔

شبہات کا ازالہ:

گذشتہ صفحات میں مثبت طور پر عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا قرآن و سنت اور اجماع امت سے متصادم اور متناقض ہونا ثابت کر دیا گیا ہے لیکن بحث و تحقیق کا تقاضا ہے کہ مخالف رائے کے دلائل پر بھی علمی انداز میں غور کیا جائے اور اگر دلائل کی قوت سے ثابت ہو جائے کہ یہ رائے قوی ہے تو اس کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ حق پسندی، حق جوئی اور حق گوئی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن جب بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وراثت میں حصہ دلانے والوں کے دلائل کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ دلیل نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ البتہ کچھ شبہات ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ متجددین اور آزاد خیال مجتہدین ان کو دلیل کا نام دے کر الجھنیں پیدا کر رہے ہیں۔

پہلا شبہ: عائلی قوانین کے حامیوں کی پہلی دلیل یہ ہے کہ **یوصیکم فی اولادکم** میں لفظ "اولاد" کے مفہوم میں پوتے بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی میراث میں حصہ دینا ضروری ہے۔ اس کا جواب قرآن و سنت اور اجماع امت سے دیا جا چکا ہے کہ اس جگہ قریب ترین اولاد مراد ہے۔ اگر یہ لوگ مطلق اولاد مراد لیتے ہیں تو پھر پوتے کے لیے اپنے باپ کی موجودگی میں بھی وراثت میں حصہ مقرر کر دیں۔ حالانکہ اس کی گنجایش تو ان کے اجتہاد میں بھی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ باپ کی زندگی میں پوتا وارث اس لیے نہیں بن سکتا کہ اس کا باپ اپنا حصہ خود لیتا ہے لیکن اس کے فوت ہو جانے کے بعد پوتا دادا کے ترکے سے اپنے باپ کا حصہ وصول کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ باپ تو مر چکا تھا اور مردے کو میراث دی ہی نہیں جا سکتی تو پوتا اپنے باپ کے کون سے حصے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہاں! اگر وہ پوتا ہونے کی حیثیت سے باپ کا حصہ نہیں بلکہ اپنا حصہ لیتا ہے تو پھر اپنے باپ کی زندگی میں بھی اسے یہ حصہ ملنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پوتا ہونے کی حیثیت پر باپ کے زندہ ہونے یا مر جانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پوتا پوتا ہی ہوتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا ذہنی الجھاؤ ہے جس میں یہ لوگ خود بھی مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا شبہ: عائلی قوانین کے ایک وکیل مولوی عمر احمد عثمانی کا ایک مضمون' ماہنامہ **فکر و نظر**' اسلام آباد' شمارہ دسمبر ۱۹۶۵ میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے قائم مقامی کے یورپین فلسفے کو دلیل قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ تقلید یورپ ہے۔ اس مضمون میں مولوی عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

> وراثت کا سارا دارومدار دراصل "قائم مقامی" کے اصول پر ہے۔ جس یتیم بچے کا باپ مر گیا ہو وہ وراثت میں اپنے باپ کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور جس بچے کا باپ ہو وہ اپنے باپ کے زندہ ہونے کی وجہ سے وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دادا اور پوتے کے درمیان باپ کا واسطہ موجود ہے جو اسے مجوب کر دیتا ہے۔ ہمارے فقہا کرام نے نہ معلوم کیوں اس بنیادی اصول یعنی "قائم مقامی" کو ملحوظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے وہ اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے یتیم پوتے کو مجوب و محروم قرار دے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہا کرام غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ یہ مضمون نویس کج فہمی کی وجہ سے یورپ کی تقلید میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ میراث کے بارے میں یورپی اقوام کا قانون یہ ہے کہ مرنے والا شخص زندہ ہونے کی صورت میں اپنے مورث سے جو حصہ پاتا ہے' وہی حصہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد پائے گی (**المبادی الشرعیه للعلامه محمصانی**)۔ جبکہ اسلام کا قانون میراث یہ ہے کہ وراثت زندہ شخص ہی

کو ملتی ہے۔ جب ایک شخص اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا اور اس نے وراثت میں اپنا حصہ لیا ہی نہیں تھا تو اس میں اس کی اولاد قائم مقام کس چیز میں بنے گی اور کیسے بنے گی؟ فقہا کرام نے "قائم مقامی" کے لیے **الاقرب فالاقرب** کے اصول کو ملحوظ رکھا جبکہ عائلی قانون کے وکیلوں نے زندہ شخص کو مورث اور مردہ شخص کو وارث بنا کر "قائم مقامی" کا یورپی اصول اپنایا ہے۔ اس پر یہی کہا جا سکتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تیسرا شبہ: معترضین کی جانب سے ایک اور غیر متعلق جذباتی بات کو بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ چونکہ اسلام نے یتیموں کی پرورش اور نگہداشت پر بہت زیادہ زور دیا ہے لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ یتیم پوتوں کو اپنے دادا کے ترکے میں حصہ دیا جائے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک خلط مبحث ہے جس کے ذریعے یہ متجددین قرآن و سنت کی نصوص اور اجماع امت سے ثابت شدہ حکم کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں۔ گذشتہ سطور میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ تقسیم میراث کی علت یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری اور پرورش نہیں ہے بلکہ انتقال ملکیت ہے اور اسلام نے یہ اصول بتایا ہے کہ **ذوی الفروض** کے حصے دینے کے بعد جو کچھ بچ جائے، وہ **الاقرب فالاقرب** کے اصول کے مطابق عصبات میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس اصول کی روشنی میں بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو دادا کی ملکیت منتقل نہیں ہو سکتی۔ باقی رہی یتیم پوتوں کی خبر گیری اور معاشی کفالت تو اگر ان کے باپ نے کوئی جایداد نہ چھوڑی ہو تو ان کی کفالت دادا کے ذمے واجب ہے اور دادا کی غیر موجودگی میں دوسرے عصبات پر **الاقرب فالاقرب** کے اصول پر لازم ہے۔

اسلام میں **نفقة الاقارب** کا قانون موجود ہے۔ جس کی تفصیل اس وقت موضوع سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ دادا اپنی زندگی میں پوتوں کو اپنی جایداد کا کچھ حصہ ہبہ بھی کر سکتا ہے مگر ہبہ کردہ جایداد کی ملکیت اس وقت تک منتقل نہیں ہو سکتی جب تک کہ پوتوں کو یا ان کے ولی کو قبضہ نہ دیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دادا اپنے کل املاک کے ایک تہائی حصے تک پوتوں کے لیے وصیت کر کے کسی دیانت دار شخص کو وصیت کے نفاذ کے لیے اپنا وصی بنا لے۔ وصی بیٹا بھی ہو سکتا ہے، بھائی بھی ہو سکتا ہے، اور کوئی اجنبی بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں بعض اوقات پوتوں اور پوتیوں کو بیٹوں اور بیٹوں سے زیادہ حصہ مل جائے گا۔ اسلام کے بتائے ہوئے ان طریقوں کو نظرانداز کر کے "یتیم پوتے پر رحم" کے نام سے قرآن و سنت اور اجماع امت سے ثابت شدہ حکم بدلنا اجتہاد نہیں ہے بلکہ تحریف ہے۔ **اعاذنا اللّٰه منه**۔ رحم و شفقت کا مستحق صرف پوتا ہی نہیں ہے بلکہ یتیم بھتیجا، یتیم بھانجا اور غیر رشتے دار یتیم بھی رحم و شفقت کے مستحق ہیں۔ مگر اس اصول کے تحت بیٹے کی موجودگی میں، میراث میں انھیں حصہ کیوں نہیں دیا

جاتا؟

چوتھا شبہ: عائلی قوانین کے حامیوں نے ایک اور شک و شبہ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے جو یہ ہے کہ **الاقرب فالاقرب** کا جو قاعدہ فقہا نے بنایا ہے وہ کوئی باقاعدہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ اس کے ٹوٹنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص ایک بیٹی اور ایک پوتا چھوڑ کر فوت ہو جاتا ہے تو اس کے ترکے کا نصف بیٹی کو ملے گا اور نصف پوتے کو دیا جائے گا یا مثلاً یہ کہ ایک شخص نے اپنے وارثوں میں دو بیٹیاں، ایک پوتا اور ایک پوتی چھوڑی ہو تو اس صورت میں دو تہائی دو بیٹیوں کو دیا جائے گا اور باقی ایک تہائی پوتا اور پوتی آپس میں اس طرح تقسیم کریں گے کہ پوتے کا حصہ پوتی سے دگنا ہو گا۔

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ **الاقرب فالاقرب** کا قاعدہ فقہا نے نہیں بنایا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور جس ارشاد رسولؐ میں یہ قاعدہ بیان ہوا ہے اس کے متن میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ قاعدہ عصبات کے لیے ہے، **ذوی الفروض** کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے کہ **ذوی الفروض** بھی متعین ہیں اور ان کے حصے بھی متعین ہیں۔ ان میں **الاقرب فالاقرب** کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ مثالوں میں ایک بیٹی یا دو بیٹیاں **ذوی الفروض** ہونے کی حیثیت سے اپنا مقررہ حصہ لینے ہی کی حق دار ہیں اور ان سے جو بچ جائے وہ پوتا اکیلے یا پوتا پوتی دونوں مل کر بطور عصبہ لیں گے اس لیے کہ بیٹے کی غیر موجودگی میں یہ قریب تر ہیں۔ البتہ پوتے پوتی کی موجودگی میں پڑپوتے اور پڑپوتی کو کچھ بھی نہیں مل سکتا اس لیے کہ وہ اقرب نہیں ہیں۔ **الاقرب فالاقرب** کا قاعدہ تب ٹوٹتا کہ کوئی ایسی مثال موجود ہوتی جس میں قریب تر عصبہ کے ہوتے ہوئے بعید کو وراثت میں حصہ دیا گیا ہوتا۔ لیکن ایسی کوئی مثال ہمارے علم میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ شبہ یا تو میراث کے احکام و قواعد سے ناواقفیت پر مبنی ہے یا پھر دانستہ طور پر کج بحثی کے ذریعے شرعی حکم کو مشتبہ و مشکوک بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دونوں صورتیں بڑی افسوس ناک ہیں۔

پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں وراثت میں حصہ دار بنانے کا اسلام کے احکام کے ساتھ تصادم تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کی دو مزید مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

(۱) اس دفعہ کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی جب اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو جائے تو اس کی اولاد کو اپنے نانا کے ترکے میں وہی حصہ ملے گا جو بیٹی کو اس کے زندہ ہونے کی صورت میں ملتا، حالانکہ بیٹی کی اولاد **ذوی الارحام** میں شامل ہے اور **ذوی الارحام** اگرچہ حنفیہؒ، مالکیہؒ اور حنابلہؒ کے نزدیک میراث لے سکتے ہیں مگر **ذوی الفروض** اور عصبات کی موجودگی میں محروم رہتے ہیں۔ لیکن عائلی قوانین کی زیر غور دفعہ عصبات کی موجودگی میں بھی نواسے اور نواسیوں کو وارث بناتی ہے جو شرعی حکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑ کر فوت ہوا ہو تو اس صورت میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بخاری و مسلم میں یہ نقل ہوا ہے کہ بیٹی کے لیے نصف حصہ ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ ہے تاکہ دو تہائی پورے ہو جائیں۔ اور باقی ایک تہائی (عصبہ مع الغیر ہونے کی وجہ سے) بہن کو ملے گا (بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ ابن مع ابنیۃ)۔ لیکن عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کی رو سے بیٹی کو ایک تہائی ملے گا اور پوتی کو دو تہائی حصہ ملے گا۔ اس لیے کہ یہ اپنے باپ کا حصہ لیتی ہے اور اس کے باپ کا حصہ تو ظاہر ہے کہ دوگنا ہے باقی رہی بہن تو وہ اس دفعہ کی رو سے محروم رہے گی۔ یہ ہے ان متجددین کا اجتہاد کہ صلبی بیٹی کو ایک تہائی دیا جا رہا ہے اور پوتی کو "قائم مقامی" کے یورپی اصول کے تحت دو تہائی سے نوازا جا رہا ہے اور بہن کو عصبہ مع الغیر ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!!

میں معزز شرعی عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کا خلاف اسلام ہونا واضح اور قطعی دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہے، اس لیے اس کے خلاف اسلام ہونے کا فیصلہ صادر فرما دیا جائے۔

قرآن فہمی کورس

یکم اکتوبر تا 10 نومبر

روزانہ صبح 7 تا 8 بجے

مقام : 9/2 جیل روڈ، گلبرگ 5

کلینک ڈاکٹر احمد خان ۔ ڈینٹل سرجن

مدرس : **پروفیسر خاور بٹ**

☆ قرآن پڑھانے کا آسان انداز

☆ ترجمہ اور عربی گرائمر ساتھ ساتھ

نوٹ :- رجسٹریشن فارم شام 5 تا 9 بجے کلینک سے حاصل کیے جاسکتے ہیں

قرآن فہمی پراجیکٹ

9/2 جیل روڈ، گلبرگ 5، لاہور ۔ فون : 5757474 - 5757272